

عین رشیدخان

لکنوفی

چال



آبنوسي خيال

عین رشید خان

دوستوں اور نیک
لوگوں کے لئے

جملہ حقوق

بحق نسیم خان، فرح خان، سنبل احمد محفوظ

کتاب کا نام : آہنوسی خیال

شاعر کا نام : عین رشید

سال اشاعت : ۱۹۰۲ء

تعداد اشاعت : بارہ سو

کپوزر : مقصود حسن۔ نیواشین پر نظر۔

29/7۔ فیرس لین، کلکتہ۔ ۳۰۰۰/-۔

پرنٹر : بھل کے دتا۔ اے اوپی (انڈیا) پرائیوٹ لمیلیڈ۔

127/1۔ اے جے سی بوس، روڈ۔ کلکتہ۔ ۳۰۰۰/-۔

پبلیشور : بیگم نسیم خان۔ فلیٹ 47۔ بلاک 7،
25/1A۔ گڑیاہات روڈ، کلکتہ۔ ۳۰۰۰۲۹۔

تفصیل کار : مٹاٹی بک ڈپ۔ 125، رابندر اسرائی، کلکتہ۔ ۳۰۰۰۷۳۔

قیمت : Rs. 100/-

ترتیب

۵	چند باتیں
۷	عین رشید اور ان کی شاعری
۱۶	عین رشید
۱۹	غالب اور عین رشید
۲۲	عین رشید کا داروغہ مفارقت
۲۶	عین رشید ایک نظر میں

نظمیں

۳۱	ہم وہاں دیر سے پہنچ
۳۳	شہر
۳۵	شہر
۳۷	شہر
۳۸	شہر
۳۹	آہنوں کی خیال
۴۲	میرے بعد آ
۴۳	قطلوں میں خواب
۴۵	بیڑیاں
۴۹	عینی بیٹی
۵۷	کھلے ہیں پھول پھر
۵۸	زرد پتے

۵۰	سمندر کا خیال
۵۲	ہم سفر
۵۳	۱۳ اور دسمبر
۵۴	پیار گڑیا
۵۶	کون ہے تو؟
۵۸	رات اور صبح
۶۲	سر کش
۶۴	پہلا دا سرہ
۶۶	سیب اور مصور
۶۸	کتبہ
۶۹	ایک لوری..... صرف اپنے لئے
۷۰	اسلامی جنتی کا پہلا دان
۷۳	کون ہے اپنا؟
۷۵	درو تبسم
۷۶	چھپ رہو
۷۸	نہر سکوت
۸۰	تاریخ کی الٹی طرف
۸۲	زیگس اور بازگشت
۸۳	جانایانہ جانا
۸۵	چ میں جکڑا ایحیمان
۸۸	ماں تم کیوں ناراض ہو مجھ سے؟
۹۰	آخری انظم
۹۴	زیادہ نہیں

چند باتیں

آج ہم بے حد خوش ہیں کہ عین رشید کا مجموعہ کلام "آنسوی خیال" ان کے قدر انوں کی نذر کر سکے۔ آج ہم بے حد مغموم ہیں کہ یہ کتاب رشید کی زندگی میں پیش نہ کی جاسکی۔

مرحوم بار بار مجموعے کی کتابت کرواتے رہے، بار بار اس کے اوراق گم کرتے رہے، ایک پر لیں سے چھپوانے کی بات بھی لکھی کر لی تھی۔ پچھے مال مالہ بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر حسب عادت کام روک دیا گیا۔ نہ وسائل کی کمی تھی نہ کارکنوں کا قحط، مگر نہ جانے کیوں کتاب کی طباعت کا وقت ملتا رہا اور آخر کار وہ گھڑی آپنچی جب رت جگوں کا ساتھی سب کو جاگتا چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا اور "آنسوی خیال" کی اشاعت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

شوہر کی اچانک موت سے بیگم رشید پر کوہ غم ٹوٹا، مگر صبر جمیل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ یہ تہیہ کر لیا کہ مرحوم کی شعری تخلیقات کتابی شکل میں جلد از جلد ادب نوازوں تک پہنچا دی جائیں۔

ہر چند کہ بیگم صاحبہ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور علمی ادبی ذوق بھی رکھتی ہیں۔ تاہم تن تہا سینکڑوں رسالوں، کتابوں اور کاغذات کے انبار سے مرحوم کی گم شدہ نظموں کو ڈھونڈنا کالنا، پھر ان کی ترتیب، ترجمیں، کتابت، طباعت اور اشاعت کے صبر آزماء مرحلوں سے گذرنا محترمہ کے لئے ہفتھوں طے کرنے سے کم دشوار نہ تھا۔ یہ مشکل آسان کر دی مس را کبھی چکرورتی نے، ورنہ ہندی اور اردو رسم الخط میں بیک وقت کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہو سکتی۔

جناب احمد سعید ملیح آبادی 'میر روزنامہ آزاد ہند' کلکتہ کے مفید مشوروں نے ہمیں راستہ دکھایا۔ نیوایشن پر نظر کے مالک جناب مقصود حسن نے ٹائپ سینگ کی ذمہ داری سنچال کر ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ شری بھل دت (اے۔ او۔ پی، انڈیا پرائیویٹ لمیئڈ) نے طباعت کے بکھیروں سے ہمیں نجات دلادی۔ سرورق کی حسن کاری شری سینیل شیل کے خلوص کا عطیہ ہے۔ ہم چاروں حضرات کے شکر گذار ہیں۔ الشریش کے لئے ہم و سیم آر۔ کپور اور پرکاش کر موکار کے ممنون ہیں۔

اس مجموعے میں شامل سب نظمیں (سوائے آخری نظم کے) ہندوپاک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر سندِ اعتبار حاصل کر چکی ہیں۔

یہ تو نہیں معلوم کہ کس 'کافر' نے پہلے یہ "مذهبِ عشق" اختیار کیا یعنی اردو میں شری نظم نگاری کی طرح ڈالی لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس اجنبی صنف کو مقبول اناਮ بنانے کا سہرا عین رشید کے سر ہے۔ ہم نے مر حوم کو شری نظمیں سنا کر مقامی اور بیرونی مشاعرے لوٹتے دیکھا ہے۔

شاعر اور کلام شاعر کے تعارف کے لئے انتظار حسین، شمش الرحمن فاروقی، ڈاکٹر مظفر حنفی اور خاکسار کے مضامین شامل کتاب ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ خوب صورت شاعر کا حسین مجموعہ کلام بُنگلہ کی طرح (مر حوم کی زندگی میں اس کتاب کا بُنگلہ ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے) ہندوپاک کے ہندی اور اردو حلقوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

یکم عین رشید کا بہت بہت شکر یہ۔ راکھی چکرورتی کو بہت بہت دعا میں۔

کلکتہ۔

اعزاز افضل

۱۵ / نومبر ۲۰۰۷ء

عین رشید اور ان کی شاعری

عین رشید کی نظمیں کہتی ہیں، باطل ہے یہ خیال کہ تنقید اصول وضع کرتی ہے اور شاعری ان پر بھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سفر طے کرتی ہے۔ تخلیق کی دنیا میں روزِ اول سے ہوتا آرہا ہے کہ فنکار نے اپنے خون جگر سے فن پارے تخلیق کئے اور نقادا پنے فیتے ترازو لیکر آگیا۔ ناپ توں کر، ٹوں کر، چکھ کر، سونگھ کر اور جانے کن کن طریقوں سے آزمائے کے بعد نتیجے برآمد کئے کہ اس چوکور فریم میں فٹ بیٹھنے والی نگارشات اچھتی ہیں اور جو اس پیمانے پر پوری نہیں اتر تیں وہ ناقص ہیں۔ پیمانوں سے بے نیاز تخلیقات جنم لیتی ہیں اور تنقید اٹھیں چھانٹ چھانٹ کر اچھے برے کے زمرے میں درج کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی نقاد آتا ہے، اپنا نیا سانچہ ڈھالتا ہے اور برے زمرے کی بہت سی چیزیں اس پر کھڑی ثابت ہوتی ہیں۔ پھر نیا شاعر، کھرا شاعر، ایسی شاعری پیش کرتا ہے جو سابقہ کسی سانچے پر فٹ نہیں ہوتی اور تنقید ایک نیا، پھر ایک اور نیا سانچہ بناؤ کر اسے محصور کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس لئے صاحبِ ذوق کو تنقیدی سانچوں پر بہت زیادہ انتھصار نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ ادب اور شعر کی دنیا میں ہمیشہ دو اور دو چار نہیں ہوتے۔

یادش بخیر! پہلے صرف پابند نظمیں کہی جاتی تھیں پھر معاً نظمیں وجود میں آئیں۔ کچھ آگے چل کر ترقی پسندوں اور حلقوں اربابِ ذوق والوں نے آزاد نظم کو روایج دیا اور چشم بدور آج کل نشری نظم کا چلن عام ہے۔ بادیِ انتظار میں زیر بحث نظمیں بھی نشری لگتی ہیں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو میں پابند نظم کی روایت اتنی چھتنا رہے کہ اس کے سامنے میں نثری نظم ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ ہندی میں کھڑی بولی کی پابند شاعری کا سرمایہ بہت محدود ہے (وہاں اچھی پابند شاعری دراصل برج، اودھی، راجستھانی وغیرہ بولیوں میں نظر آتی ہے) اس لئے کھڑی بولی میں اردو آمیز نثری نظم کے لئے وہاں فضا زیادہ ہموار ہے۔ بائیں ہمہ میں عین رشید سے کہتا رہا ہوں کہ جب نثری نظم تمہاری آواز میں سنتا ہوں (ساقی فاروقی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے) تو وہ اچھی لگتی ہے، دل کو چھوٹی ہے، شاید یہ تمہاری شخصیت کا جادو ہے، ڈرامائی انداز میں پیش کش کا کمال ہے۔ لیکن اب پیش افظ قلم بند کرتے ہوئے ان نظموں کو عروضی خورد بین سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حقیقی معنوں میں انہیں نثری نظم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ پوری طرح آزاد نظمیں بھی نہیں ہیں۔ کلیتًا معمراً بھی نہیں اور پابند تو ہرگز نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کسی خانے میں سیدھے سجھاؤ پوری طرح فٹ نہیں ہوتیں۔ ڈھرے سے ہٹی ہوئی نظمیں ہیں یہ۔

کہتے ہیں فن شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ آئیے اس آئینے کو سامنے رکھ کر دیکھیں ان نظموں کو۔ عین رشید کے روز و شب سے واقفیت رکھنے والوں میں طرح طرح کے لوگ ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عین رشید بے حد خلیق اور شریف آدمی ہے۔ کسی کے نزدیک وہ شہادتی بچے کو دو دھن کے وعدے پر چھپے ماہ تک زندہ رکھ سکتا ہے۔ کوئی اسے شاعر کی حیثیت سے پہچانتا ہے، کوئی اس کی سیر چشمی کا مداح ہے تو کسی کے خیال میں عین رشید ایک رند لا ابالی ہے۔ ایک صاحب اسے انتہائی ذمہ دار افسر قرار دیتے ہیں تو دوسرے اسے زیر ک مہصر اور منفرد فلم ساز کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ موسیقاروں سے سنا کہ عین رشید کو موسيقی کے رموز و نکات میں درک حاصل ہے۔ ظاہر بینوں کے لیے یہ تمام باتیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر تاہناک شخصیت ہیرے کی طرح بہت سے پہلوؤں سے ترشی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ وہ گفتگو کے فن سے آشنا اور آواز میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ ہے۔ ادا نگی میں کمال رکھتا ہے،

بیک وقت اردو، انگریزی، پشتو، فارسی، ہندی اور بنگلہ جیسی پانچ بڑی زبانوں پر عبور رکھتا ہے اور عمر کی اس منزل میں خوب و اور دلکش، وجیہہ اور جامدہ زیب ہے۔ ایسی پہلو دار شخصیت کا فن یک رخا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی سوچ پہلو دار ہے، نظمیں بھی پہلو دار ہوں گی۔

شخصیت کے اس آئینے کے سامنے رکھنے پر رمز کھلا کہ عین رشید کی نظمیں بیک وقت پابند، معر۲، آزاد اور نشری نظمیں ہیں۔ مثال کے طور پر ”سمندر کا خیال“ سے کچھ مر بوط اور غیر مر بوط مصروع دیکھئے:

اپنا گھر اجنبی سا گلتا تھا	ہر طرف ابتری کا منتظر تھا
ایک لکنت زده سی ویرانی	در و دیوار پہ تھی حیرانی
یہ حسیں وادیاں اس سے مانوس تھیں	سب حسیں وادیاں یک بیک سو گئیں (پابند)

کتنی ماہیوس تھی قریب تھی وہ، جیسے ساحل ہوا کہ سمندر سے راس کی تصویر اس کے ہلتے لب رسارے منظر ہیں زیر آب کہیں راک تلاطم کے بعد سر کنڈے رشام کے دودھیا دھنڈکوں میں ر تہا تہا ادا اس پھرتا ہے رنا امیدی کی نیلگوں چادر راک سمندر سی پھیل جاتی ہے ررات جب سکیوں میں ڈھلتی ہے ر پھر سمندر کی یاد آتی ہے۔ (معر۲)

روکتے تھے اس پیائش ویرانی سے ر صح سے کیوں یہ سمندر کا خیال ذہن میں آج تھیڑے مارے ر جیسے پاتال میں چھپ جاتے ہیں ر شام کے دودھیا دھنڈکوں میں (آزاد) وہ کہ سویا ہے یا کہ جاگا ہے ر کہر آلو دہن دریجوں میں ر جب وسیع کائنات چھپتی ہے ر جیسے ساحل ہوا کہ سمندر سے (معر۲)

اس کی رخصت مانند پرواز

آج پھر زیر دل

ایک معصوم خواہش کی شدت نہ ہو

پھر کسی ادھ جلے خواب کی جستجو تو نہیں
 تتلیاں سبز و نیلیں
 سر پھرے رقص و بو کے جہاں
 کتنی مانوس و سرشار ہیں

نظم کے ابتدائی نو مصروعوں میں لمبیہ، بصری، سمی اور شامی پیکر ایک دوسرے سے آمیز ہو کر کتنے حیاتی لہرے بناتے ہیں اور ان میں کتنے معدیاتی ابعاد ابھرتے ہیں! میں زیادہ مثالیں پیش کرنے سے گریز کروں گا کہ یہ نظمیں اتنی گٹھی ہوئی اور منشو کے افسانے کی مانند حشو و زوائد سے اتنی پاک ہیں کہ مکمل صورت میں ہی لطف دیتی ہیں اور ان میں سے اقتباس تراشتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر ان کی آنکھیں طستری میں پیش کر کے ناظرین کو انہیں خوبصورت کہنے پر مجبور کیا جائے۔

یہ بحث ہے کہ عین رشید Oral Tradition پر یقین رکھتے ہیں اور نظم پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نہیں بلکہ خود نظم اپنے آپ کو ادا کر رہی ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ نظم خوانی اور ادا یگی کی مشق بھی عین رشید نے خوب بہم پہنچائی ہے۔ لیکن ان خصوصیات اور کمالات کو بروئے کار لَا کر نیاز حیدریا و امّق جو پوری جیسے شاعروں کی نظموں میں جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ بیشک عین رشید کی کچھ نظمیں بیانیہ ہیں مثلاً شہر، بیڑیاں، آہنوں کی خیال وغیرہ۔ لیکن بیانیہ اسلوب کے باوصف عین رشید کی ادا یگی کے دوران ایسا لگتا ہے جیسے ایک نظم کے بطن سے دوسری اور دوسری کے بطن سے تیسری نظم برآمد ہو رہی ہے۔ غالب نے غزل کے تعلق سے کہا تھا۔

جنبینہ معنی کا طسم اس کو سمجھئے
 جو لفظ کے غالب مرے اشعار میں آوے
 یہ قول عین رشید کی نظموں پر بھی چپاں کیا جاسکتا ہے۔ جن میں علامات کے

لاشوروی اور لفظوں کے شعوری التزام نے معنوی پر تیس ڈالی ہیں۔ اب یہ سننے اور پڑھنے والے کے تجربات کی وسعت اور احساسات کی اثر پذیری پر منحصر ہے کہ وہ بالائی سطح کے علاوہ اور کتنی معدنیاتی پر توں تک پہنچتا ہے۔ یہ نظمیں جن میں سے مختصر ترین "۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء" چار مصری عوں پر مشتمل ہے اور طویل ترین "شہر" پانچ Composition میں پھیلی ہوئی ہے۔ نہ صرف اعتبار سے، ہی پابند، معراج، آزاد، نشری، مختصر اور طویل کی حد بندیوں کو توزیتی اور کاٹتی، ہیں بلکہ موضوعات و مواد کے اعتبار سے بھی مختلف اصنافِ سخن کو ایک دوسرے میں آمیز کرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً "شہر" "آنسو سی خیال" وغیرہ جدید افسانے کی یاد تازہ کرتی ہیں تو "سیب" اور "تصور" "تاریخ کی الٹی طرف" وغیرہ میں "داستانوی فضا" سائنس لیتی ہے۔ "ہم وہاں دیر سے پہنچے"، سفر نامے کا مزادیتی ہے۔

ایک اور سال بیت گیا اضطراب کا

ایک اور شام ڈھل گئی بے چینیوں کی آج
ایک اور دن کی شام کسی طرح ہو گئی
”کچھ دے دلا کے حال کو ماضی بنالیا“

اویس دنوں مصری عوں میں لفظ "اور" کی نشست پر غور کیجئے۔ عام شاعر اسے پہلے مصری میں سال، اور دوسرے مصری میں "شام" کے بعد استعمال کرتا لیکن ظاہر ہے اس صورت میں شعر کا لہجہ اتنا کاٹ دار نہ رہتا۔ "دے، دلا، حال اور لیا" میں دال اور لام کی کار فرمائی بھی توجہ طلب ہے۔ عین رشید نے ان دنوں مصری عوں کو بھی آخری دنوں مصری عوں کی طرح نشری ساخت میں ڈھالا ہوتا تو یہ نظم نیم نشری، یہم معراج ہو جاتی جبکہ موجودہ شکل میں تمام مصری بھرپور غنائیت کے حامل ہیں۔ تیسرا اور چوتھا مصری نشری ساخت میں ہونے کے باوجود سہلِ ممتنع کے حامل غزل کے شعر کی طرح چھتارہ دیتے ہیں اور پہلے دو مصری عوں ہلکی سی مردوڑ کھا کر کیسی تر نم ریزا اور اثر انگیز ہو گئے ہیں۔ یہ سب

لفظوں کے التزام کی کار فرمائی ہے۔ آتش نے شاعری کو مرصع ساز کا کام کہا ہے۔ ہمارے دور کے نظم نگاروں میں مرصع سازی کا سلیقہ عین رشید سے بہتر بہت کم شاعروں کو آتا ہے۔ نظمیں تو نظمیں ان کے کم و بیش ہر مصرے میں لفظوں کا التزام اور فقروں کا دروبست، بحر، قافیَ اور ردیف کی تکرار سے آزاد رہ کر بھی الفاظ و تراکیب کے صوتی آہنگ سے گونجتا محسوس ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ دوسرے نظم کو اکثر ترکیب سازی کے پھیر میں پڑ کر بے سرے ہو جاتے ہیں۔ لیکن عین رشید کی نظموں میں ”نیلی تاریکی، شگفتہ قمیقہ، بے ساز و سعت، غسلوں کے خواب، تاریخ کا شاطرانہ صحن، لکنت زدہ ویرانی، بے نواحی، زخمی پرندے جیسی برق، چنگھاڑتی دھوپ، ندامت کے روزے اور ایسی ہی سینکڑوں نادر ترکیبیں ملیں گی جو تازگی اور شگفتگی کی مظہر ہیں اور سرتاسر نئی ہونے کے باوجود نظموں میں اس طرح گھلی ملی ہیں کہ غراابت کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔

عین رشید کی وہ نظمیں جن میں جملوں کی ساخت نثر سے زیادہ قریب ہے (شہر کے سلسلے کی تمام نظمیں، سیب اور مصور، ہم وہاں دیرے سے پہنچے، قسطوں میں خواب، لوری وغیرہ) نوبہ نوحیاتی پیکروں سے آباد ہیں اور یہ پیکر جامد نہیں اور ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ واضح حکم لگانا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ پیکر مثال کے طور پر بصری ہے، سمعی ہے یا لمبی ہے۔ دیکھنے ان کی نظم ”بیمار گڑیا“ کے مصرے

کہ شاید خزان چھوگئی ہے اے

آج خاموش ہے

چل کے دیکھیں کہیں

اس کی رخصت مانند پرواز

بیکر ان موچ جیسے ساحل کی گود میں آکر ہی دم لیتی ہے۔

ایک طوفان پیغم ہوا میں خروش (علیحدہ بھروس میں آزاد)

اپنی دہنیز پر کھڑا تمہار لرزتے آنسو اور دکھتا ہوا سر (نشری)

اچھی خاصی نظم کے بخوبی ادھیر نے پر، ہمارے ہاتھ یہ نکتہ لگا کہ اس نظم کے بیشتر مصرے پابند ہیں، معاصر ہیں ریا آزاد ہیں۔ انھائیں مصروف پر مشتمل نظم کا محفوظ ایک مصرع ایسا ہے جس کو قافیہ، ردیف اور بحر کی دیواروں نے قید نہیں کیا۔ ایسی صورت میں اسے نثری نظم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو عین رشید کی دوسری نظموں کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ خود شاعر نے اپنی نظموں کو کہیں نثری نظم کا نام نہیں دیا لیکن کچھ ناقدرین کافن کر شمہ ساز انہیں نثری نظم کہتا ہے۔ حالاں کہ جس طرح عین رشید کی شخصیت میں بیک وقت مختلف شخصیتیں گھلی ملی ہیں۔ اسی طرح اس انوکھے شاعر نے اپنی نظموں کو بھی بیک وقت پابند، معاصر، آزاد اور نثری ہیئت عطا کی ہے۔ کچھ لوگ اسے عجز شاعرانہ سے منسوب کریں گے۔ لیکن انہیں یاد رکھنا ہو گا کہ اردو شاعر کے بابا آدم امیر خرو (خالق باری) سے لیکر ترقی پابند شاعر ساحر لدھیانوی (پرچھائیاں) تک متعدد شعراء نے اس تکنک سے کام لیکر اپنی ایک ہی تخلیق میں مختلف بحریں استعمال کی ہیں۔ عین رشید اس ہیئتی تجربہ گاہ میں اپنے پیش روؤں سے کئی قدم آگے نکل جائے تو کم از کم اس کے کامیاب تجربوں کو سراہنا چاہئے۔

اس ضمن میں چند اور امور بھی لا تلق غور ہیں۔ میں نے اردو غزل کا پچاس سالہ انتخاب "روح غزل" مرتب کیا تو عین رشید سے بھی غزوؤں کی فرمائش کی۔ جواب ملا وہ غزل نہیں کہتے۔ پوچھا کیوں؟ کہا غزل میں مو سیقی کے صرف پانچ سر لگ سکتے ہیں (میں مو سیقی میں شد بد نہیں رکھتا اس لئے اصطلاح نادرست ہو سکتی ہے) ایسی نظمیں کہتا ہوں جن میں ساتوں سر شامل ہو سکیں۔ لیجنے نقاد کہتا ہے عین رشید نثری نظم لکھتا ہے اور عین رشید کے بقول ان کی نظموں میں غزل سے زیادہ مو سیقیت ہے۔ وہ چوں کہ مو سیقی کے گیانی ہیں اس لئے ان کی بات کو دھیان سے سننا ہو گا، ان مسئلے پر ان سے تفصیل سے گفتگو کے بعد مجھے ان کے خیال سے متفق ہونا پڑا کیوں کہ وہ کم از کم پانچ بڑی زبانیں جانتے ہیں اور ان میں سے تین زبانوں (اردو، انگریزی اور بنگالی) میں تخلیقات بھی پیش کرتے ہیں نیز

موسیقی کے رموز و نکات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کا قول ہے کہ کسی بھی دوسری زبان کے مقابلے میں اردو کے الفاظ زیادہ صوتی اور غناستیت رکھتے ہیں۔ اگر ان الفاظ کو سلیقے اور صوتیاتی التزام کے ساتھ بر تاجئے تو جملہ خواہ بحر میں ہو یا محض نثری فقرہ، اس میں ترجم اور جھنکار ضرور ہو گی۔ اس زاویے سے دیکھتا ہوں تو ان نظموں میں سے پہلا دائرہ، رات اور صح، سرکش، اور ۳۴۳ اردو سمبر وغیرہ عین رشید کی تائید میں ہاتھ اٹھائے نظر آتی ہیں۔ آخرالذکر چوں کہ مختصر ترین ہے اس لئے مثال کے طور پر در خواب اور زرد پستے، فنطاء سے ساتاڑدیتے ہیں جبکہ رات اور صح دلدو زمکڑوں میں بٹا ہوا ایک منظوم موستاثر ہے!

موضوعات و مواد کے اعتبار سے بھی تنقید ان نظموں کو کلائیکی، ترقی پسندیا جدید نظموں کے گروہوں میں نہیں بانٹ سکتی۔ الفاظ کے صوتیاتی نظام، جملوں کی تراش خراش اور فارسیت سے التباس ہوتا ہے کہ ان میں کلائیکی نظم کی شان ہے۔ ان کی مقصدیت اور عوام سے محبت کے جذبے سے سرشار، عام زندگی کے مسائل، قضع سازی، منافرت، فرقہ واریت کے خلاف یہ نظمیں جس طرح صفحہ آراء ہیں ان میں جو بلند آہنگی اور طنز کی کاث ہے ان کے پیش نظر ان پر ترقی پسندی کا لیبل بھی چپاں کیا جاسکتا ہے اور تجربیدی اسالیب و علامتی طرز اظہار نیز پیچیدہ احساسات کی ہفت پہلو عکاسی انہیں نہی نظموں کی صفحہ میں داخل کرتی ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر یہ سارے رنگ عین رشید کی نظموں میں بے حد نفاست سے بندھے اور گندھے ہیں۔ اس لئے سب لیبل ان پر سے ہٹا کر قارئین کو انہیں کھلے اور آزادوں کو سے پڑھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا مشورہ دینا چاہئے۔ ان کے مطالعے کے دوران یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ عین رشید کی شاعری نہیں ہے بلکہ یہ مختلف نوعیت کی نظمیں ہیں۔ یہ ن۔ م۔ راشد کی طرح یک لخت جست لگا کر سامنے آجائے اور چوکانے کے بجائے بند کنوں کی طرح آہتہ آہتہ کھلتی ہوئی نظمیں ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے کے مکڑوں کو چن کر اور مرتب کر کے دیکھیں تو اس میں ایک شیم واضح شکل نظر آتی ہے۔ کبھی اپنی شکل تو کبھی غنیم کی۔ عین

رشید کی نظمیں بھی کچھ ویسا ہی نقشہ پیش کرتی ہیں لیکن وہ اس حد تک علاماتی اور بند بند چھوٹی مسوئی کی طرح اپنے آپ میں لپٹی ہوئی تخلیقات بھی نہیں کہ ملارے یا کافکا کی نگارشات کی یاد تازہ ہو جائے۔ عین رشید نے غالباً حضرت علیؑ کا یہ قول دل پر نقش کر رکھا ہے کہ سلامتی کی راہ انتہاؤں پر نہیں بلکہ ان کے بین بین ہیں۔ میں یہ بات نقاد کی حیثیت سے نہیں عین رشید کے ایک ہم عصر شاعر کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے اردو نظم کے ہونٹوں پر نئے رجحانات اور نئے اسالیب کا تازہ رس نچوڑا ہے اور ان کی کاوشوں کے طفیل نظم کا شہر اپنی فصیلوں سے آگے دور تک بہت دور تک پھیل رہا ہے۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۲ء

منظف حنفی

کلکتہ یونیورسٹی، پروفیسر زکوار ڈر،

(پروفیسر اقبال چیئر و صدرِ شعبہ اردو)

کانگریز گا چھی، کلکتہ

عینِ رشید

کوئی بائیس چوبیں برس کی بات ہے۔ میرے پاس کچھ نظمیں چھپنے کے لئے آئیں۔ آہنگ میں بڑی تازگی تھی، کچھ نشو و نظم کا ملا جلا انداز تھا، پیکروں اور فقروں میں عجب آزادانہ لہر سی تھی جیسے کسی مشاق مصور نے موٹے قلم یا برش سے لکیریں کھینچ دی ہوں۔ جو بظاہر بے ربط لیکن بہ باطن بامعنی ہوں۔ شاعر کا نام تھا۔ رشید اور پتے پر اے۔ آر۔ خان، پولس آفس لکھ کر بنگال کے کسی ضلعے کا نام تھا۔ یہ بات تو صاف تھی کہ پولس میں تحقیقات یا خرافات کرنے والا یہ شاعر کوئی منتشر کرنے تھا، لیکن یہ بات بھی واضح نہ تھی کہ وہ ہے کون۔ اس بات کا امکان تھا کہ اس نے اپنا عہدہ رتبہ ازراہ کسر نفسی چھپایا ہوا یا پھر اس لئے کہ مجھ پر اس کی افسرانہ حیثیت کا اثر نہ پڑے اور نظموں کو میں ان کی قیمت پر تولوں، مصنف کی افسرانہ میزان پر نہیں۔ مجھے امید تھی کہ اول الذکر بات ہی ہو گی کیوں کہ جو لوگ میرے بارے میں تھوڑا بہت بھی جانتے ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ میں عہدے اور حیثیت کے تمام جھام سے مر عوب نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ بات تو صاف تھی کہ نئی نظم کے افق پر ایک نیاستارہ روشن ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً جواب لکھا کہ نظمیں چھپ جائیں گی اور یہ بھی عرض کیا کہ اردو میں ن۔ م۔ راشد کی طرح کا نام اور کسی کو راس نہ آیا۔ کیوں ن آپ اپنا نام عینِ رشید یا عینِ الرشید رکھ لیں؟ میری یہ درخواست قبول ہوئی۔ شاعر کا نام عینِ رشید قرار پایا اور دیگرے دیگرے یہ بات بھی کھلی کہ عینِ

رشید پر نئند نٹ پولس وغیرہ ہیں۔ اُسیں ایلیٹ کے عاشق ہیں اور اس کی نظمیں تقریباً اسی لمحے میں زبانی سا سکتے ہیں۔ نظمیں بھی چھپی تو مقبول ہوئیں اور مجھے خوشی ہوئی کہ جدید شاعروں کی فہرست میں ایک نیانام داخل ہوا۔

برسون بعد عین رشید کو پڑھنے والوں اور سننے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہوں نے بہت جلد نئی شاعری میں ایک منفرد آواز، ایک تازہ احساس اور ایک حساس روح کی شعری کیفیت کا اضافہ کیا۔ پھر ان کی توجہ مختلف چیزوں میں بٹ گئی۔ شاعری کم ہوتی گئی، شعر گولی سے تو ان کا دل ہٹنے لگا اور فلم، موسیقی، اُنی وی، دوستی، بزم آرائی یہ سب آگے آتی گئیں۔ میں دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہا۔ جعفر علی خان اثر مر حوم کی طرح یہ تونہ کہہ سکتا تھا کہ اردو ادب میں ایک کیس پیدا ہوا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا رنج ضرور رہا کہ وہ نئی آواز جو جدید اردو ادب کا حصہ بنتی، مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ آج جب عین رشید کا مجموعہ چھپ رہا ہے تو جہاں خوشی ہو رہی ہے وہاں اتنی کم (اور بعض ان میں بے حد مختصر) نظمیں دیکھ کر رنج بھی ہو رہا ہے کہ اتنے عرصے میں سو بھی نظمیں نہ ہو سکیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ضخامت میں کم ہونے کے باوجود یہ مجموعہ بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ اس میں برسون کی فکر، صدیوں کے احساس اور ان گنت ساعتوں کے مطالعے کا نچوڑ نظر آتا ہے۔ یہ کہنا آسان ہے کہ یہ نظمیں بے حد بصری اور بے حد سمعی ہیں یعنی ان کو پڑھنے وقت نہ صرف وہ مناظر تصور میں نظر آتے ہیں جن کے لئے بصری پیکر استعمال کئے گئے ہیں، بلکہ وہ آوازیں، وہ ارتعاشات بھی سنائی دیتے ہیں جن سے وہ مناظر عبارت ہیں۔ ان نظموں کو پڑھنے وقت جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ کچھ ایسی ہے گویا آپ کسی دو منزلہ کے چھچھے پر کھڑے ہوں، نیچے دھوپ کی معتدل روشنی ہے اور آپ آتے جاتے سب مناظر، تمام ٹھہری ہوئی اور مرتعش چیزوں کو صاف صاف دیکھ رہے ہوں۔ عین رشید خود ان نظموں میں اور ان مناظر میں پوری طرح رچے بے ہوئے ہیں لیکن وہ آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کرتے، آپ کو دور ہی سے دیکھتے رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو

قطوں میں خواب، سند رکا خیال، کون ہے تو، تاریخ کی الٹی طرف جیسی نظمیں وجود میں
نہ آتیں۔

مغربی ادب کے مطالعے کا اثر عین رشید کے کلام میں کیمیائی عمل کی طرح ہے،
سطح پر نہیں۔ پھر بنگالی اور جدید اردو نظم کی روایت بھی ان نظموں میں بول رہی ہے۔ یہ
نظمیں ایک ساتھ پڑھی جانے کا بھی تقاضا کرتی ہیں۔ کم شاعر ایسے ہوں گے جن کی حیث
اس درجہ مرکز اور منضبط ہو کہ ان کی کئی نظمیں مل کر ایک اکیلی نظم بناتی ہوں اور ہر نظم
کسی ایک ذہنی وقوع کی ترجمان بھی ہو۔ عین رشید سے میں بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ اور
لکھو، اپنا حق لو اور اردو کا حق ادا کرو۔ میر عبدالحی تابا۔

تو ہر گز چھوڑ یومت شعر کہنا
کہ تاباں نام رہتا ہے سخن سے

شمش الرحمن فاروقی

الہ آباد

۱۶ فروری ۱۹۹۶ء

غالب اور عین رشید

غالب کی تخلیقات کا بنگلہ ترجمہ بنگالی ذہنوں کو متاثر کر رہا ہے۔ اور اب یہ ترجمہ سب سے زیادہ مکنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس اطلاع کے لئے میں اپنے دوست مسعود اشعر کا ممنون ہوں جو کلکتہ میں ہونے والی غیر سرکاری ہندپاک دانشوروں کی کافرنس میں شرکت کرنے کے بعد وطن واپس آئے ہیں۔ اس کافرنس کا مقصد یہ تھا کہ بُرے صغير میں پُر امن ماحول پیدا کرنے کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ ایک سو ساٹھ دانشوروں کے اس قافلے میں لاہور کے کچھ ادیب بھی شامل تھے۔ یہ کارروائی بذریعہ ریل کلکتہ کے لئے روانہ ہوا تھا۔

واپسی پر ٹی ہاؤس میں ان لوگوں نے ہندستانی Adventure کی کہانیاں سندباد اشائیل میں سنائی۔ انیسویں صدی کے کلکتہ کی دلچسپیاں غالباً کے شعروں میں اچھی طرح اجاگر ہوئی ہیں۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ کلکتہ نے اپنی اس دلچسپی کا بہت کچھ حصہ کھو دیا ہے۔ جو غالباً کے زمانے میں تھیں۔ اب یہ بُرے صغير کا شاید سب سے زیادہ گنجان اور حد سے زیادہ آلووڈ شہر ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لاہوری گروپ بہت متاثر ہو کر لوٹا۔ اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مسعود اشعر نے بنگالی ادیبوں سے اپنے تبادلے خیالات کے بارے میں مجھ سے بتایا کہ یہ ادیب اپنی اردو ادب سے لا علمی پر متاسف تھے۔ اس کے باوجود بھی ایک چیز دیکھنے میں آئی کہ غالباً کو حالیہ دنوں

میں بنگلہ میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ عین رشید ہیں جنہوں نے شاعری کے دلدادہ بنگالی عوام میں غالب کا تعارف پیش کیا۔

عین رشید کی بنگلہ کتاب میں غالب کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط کا انتخاب بھی شامل ہے۔ جس کی گرم جوشی کے ساتھ پذیرائی کی گئی ہے۔ یہ کتاب تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے جبکہ پچاس ہزار صرف بنگلہ دیش میں فروخت ہوئی ہیں۔ جب بنگلہ دیش مشرقی پاکستان تھا تو غالب نے بنگالیوں کو متوجہ نہیں کیا۔ غالب کو کلکتہ سے ہو کر بنگلہ دیش پہنچنا نصیب تھا۔

عین رشید انہیں پوس سروس سے مسلک ہیں اور کلکتہ میں مقرر ہیں۔ وہ اردو بنگلہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ بنگلہ ان کی مادری زبان ہے۔ وہ بنگلہ کے شاعر ہیں اور اردو جدید نظمیں لکھتے ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں بلراج منیر اکی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل شعور میں شائع ہو چکی ہیں۔ عین رشید نے مسعود اشعر کو یہ بھی بتایا کہ غالب بنگالیوں میں کم مشہور نہیں ہیں۔

مسعود اشعر نے ایک بنگالی شاعر سے پوچھا تھا کہ عین رشید کے ترجمے کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں۔ اس شاعر نے کہا کہ ”اردو سے نابلد ہونے اور غالب کو نہیں پڑھنے کی وجہ سے میں اس ترجمے پر اپنی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا جو سرمایہ بھی پاس ہے وہ اپنی شاعری ہے اور اپنی انفرادی خوبصورتی ہے۔“

ہم جانتے ہیں کہ جب غالب ہندی میں چھاپے گئے تو یہ کامیاب اقدام تھا۔ پھر بھی ہندی کا بنگلہ سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندی چونکہ لسانی اعتبار سے اردو سے تعلق رکھتی ہے اس وجہ سے اس میں غالب کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے غالب کی شاعری کو بس ناگری رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فارسی تراکیب

اور دیز ابہام کے باوجود بھی ہندی سرکل میں غالب نے شہرت حاصل کر لی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ ہندستانی تہذیبی ماحول میں غزل کی پذیرائی غالب کی وجہ سے ہی ہے۔

لیکن بنگالیوں تک پہنچنے کے لئے غالب کو بگلہ ترجمے کی ضرورت تھی۔ اور شاعری کا ترجمہ ایک مشکل کام ہے۔ کسی بھی شاعری میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا ہوتا ہے جو کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود بھی ہم ناقابل ترجمہ کو بھی ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح ہم ترجمہ شدہ شاعری کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی پڑھتے ہیں کہ اس کام میں بہت کچھ گم ہو چکا ہے۔

درحقیقت ایک تخلیقی ترجمہ ہی اچھی شاعری کے گریز کو کچھ حد تک سمیٹ سکتا ہے۔ اور یہ یقیناً پڑھنے والوں کو ایک مختلف زبان کے شاعر اور مختلف شعری روایت سے آگاہ ہونے میں مدد کرتا ہے۔ عین رشید خود ایک شاعر ہیں اور ان سے ایسے ترجمے کی امید کی جاسکتی ہے۔ بنگالیوں میں غالب کی شہرت کی یہی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

انتظار حسین

ڈان میگزین - پاکستان

مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۹۴ء

عین رشید کا داع مفارقت حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اس کے ہاتھ پارس تھے، قلم پارس تھا، زبان پارس تھی۔ وہ سر اپا پارس تھا۔ جس کو چھوا سونا بنادیا۔ نشری نظمیں کہیں تو ان کی قیمت بڑھ گئی۔ مضمون لکھنے تو اس کے دام آسمانوں کو چھونے لگے۔ تقریب کی تو ایسی گرفتار ہوئی کہ بس۔ افسری کی تو عہدہ اپنی بلندی قسم پر ناز کرنے لگا۔ دوستی کی تو اس کو تقدس کے منصبِ جلیلہ پر فائز کر دیا۔ فلم ”ساتواں آدمی“ بنائی تو اس کی شہرت ساتویں آسمان تک گئی۔ امیر خان پر سیریل بنایا تو موسیقی ”آفریس، صد آفریس“ کہنے پر مجبور ہو گئی۔ بسم اللہ خاں کا انٹرویولیا تو شہنائی ملکن گنانے لگی۔ ”شترنج کے کھلاڑی“ کی بساط پر ستیہ جیت رائے کومات کھانے سے صاف بچالیا۔ بنگالیوں کو کلامِ غالب کا ایسا چکارا گا دیا کہ ان کی زبان آج تک چھارے لے رہی ہے۔ غزل کو خون کی طرح ان کی رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ڈاکر کڑاں کا لوہا مانتے تھے۔ اداکار اس کو گرو جانتے تھے۔

خاندان کی آنکھوں کا تارا، احباب کا دارا، ضرورت مندوں کا سہارا، بھیلا ایسا کہ کتنی زیخاؤں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں، مگر نہ دامن چاک ہوانہ پاک دامنی پر آئچ آئی۔ اوچے لوگوں کے سامنے سراہنا کر گیا۔ یونچے والوں سے جھک کر ملا۔ اعلیٰ ترین منصب تک پہنچا مگر بالائی آمدنی کی طرف مزکر بھی نہ دیکھا۔ سینہ کدورت سے پاک، خزینہ

دولت سے خالی۔ دل محبت کے جذبے سے لبریز۔ ذہن فکر و شعور کے نور سے معمور۔
سیکولرزم کی جان، مگر سچا مسلمان۔ کھرا انسان۔ خالص پٹھان۔

”چاندنی“ کی دھوپ میں تپا۔ مولانا آزاد کالج کلکتہ سے بی اے آنرز
(انگریزی) کی ڈگری لی۔ آزادی کے بعد وہ پہلا مسلمان تھا جس نے مغربی بنگال سے آئی پی
ایس کے کل ہند مقابله جاتی امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ نکسلی دور میں حواس باختہ
پولس فورس کو اپنی دلیرانہ قیادت سے نیا حوصلہ بخشا۔ وہ پہلا مسلمان افسر تھا جس کو کلکتہ
میں ڈی سی ڈی بنتے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ عہدوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر
عہدے اس کے پیچھے بھاگتے گئے۔ آخر ڈائرکٹر جنرل کی کرسی نے اس کو جگہ دے کر اپنا
رتبا بلند کیا۔

ہمایوں کبیر اور پروفیسر اے۔ ڈبلو۔ محمود کے بعد مسلمانوں میں ایسا نابغہ روزگار
کا ہے کوپیدا ہوا ہو گا۔ بنگال کے مسلم معاشروں میں نہ شاعروں کی کمی ہے، نہ عالموں کی، نہ
دانشوروں، کی اگر کمی ہے تو ایسے اشخاص کی جو غیر مسلم حلقوں میں ہمارے مذہب، زبان،
ادب اور تہذیب کی نمائندگی کا حق ادا کر سکیں۔ جو ہر حلقے میں قابل قبول ہوں۔ بیسویں
صدی کے آخری دہائیوں میں اگر یہ فریضہ کسی نے ادا کیا ہے تو بلاشبہ وہ ذات ہے عین رشید
کی۔ مرحوم نے انگریزی اور بنگلہ پر وہ قدرت حاصل کی تھی کہ ہم اردو پر بھی ایسی دسترس
حاصل کر سکتے تو اپنی خوبی قسمت پر ناز کرتے۔ اس کے لمحے کی مردانہ لکھنک، اور گفتگو کا
ڈرامائی انداز سامعین کو ایسا مسحور کرتا تھا جیسے بنگال کا چلتا جادو۔ اللہ ری اس کی روح دھجج،
جلسوں کی شان بڑھانے والا، مشاعروں میں جان ڈالنے والا، محبوب، مقبول اور ہر داعزین،
با ادب، با اخلاق، با تمیز۔

اللہ نے مرحوم کو بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان میں ایک خصوصی نعمت کا نام
نیسم خان (بیگم رشید خان) ہے۔ شوہر لا ابالي، بیگم ذمۃ دار۔ رشید خان خانہ داری کے

معاملے میں کوئے، نیم سکھڑ، سلیقہ مند، مہمان نواز، متواضع۔ صح ہے تو چائے ناشتہ حاضر، دوپہر ہے تو دستر خوان آراستہ، نہ امیر و غریب کی تفریق، نہ اعلیٰ اور ادنیٰ کا احتیاز، اژدی اور چپر اسی تک کوڈا ننگ نیبل پر بٹھا کر کھلانا اس اعلیٰ ظرف خاتون کا معمول رہا ہے۔ شوہر کی دیکھ بھال، خانہ داری کے کام کاج، بچیوں کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ کے فرائض اس طرح انجام دئے کہ کوئی مرد بھی کیا دیتا۔ کبھی شوہر کی سرکاری گاڑی استعمال نہ کی۔ ہمیشہ پیدل یا ٹرام، بس اور ٹکسی پر سفر کرتی رہیں۔ ڈائرکٹر جزل کی والف، نہ بادی گارڈن سیفٹی آف لائف۔

نی نویلی تھیں تب بھی، بال بچے دار ہوئیں تب بھی۔ ساس بنیں تب بھی مشرقی آداب و مذہبی فرائض کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ رمضان میں افطار پارٹی، عید، بقر عید میں دعویٰ تیں اور ضیافتیں کبھی ناغذہ نہ ہوئیں۔ رشید کے ماما (جگت ماما) اکثر کہا کرتے ”اگر نیم (بیگم رشید) نہ ہو تیں تو رشید کہیں کے نہ رہتے“۔

ماما کو رشید کی زندگی میں وہی اہمیت حاصل تھی جو راجا بیر بل اور تان سین کو دربارِ اکبری میں۔ وہ مرحوم کے ماما بھی تھے، دوست بھی تھے، مشیر بھی تھے، ناصح مشفق بھی تھے۔ ماما نگیت سرات کا فرض بھی نبھاتے تھے اور پرائیوٹ سکریٹری کی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ سائے کی طرح ساتھ رہتے۔ بعض اوقات رشید کے سی اے (C.A) کارول بھی ادا کرنے لگتے۔ ایک دن رشید نے اطلاع دی کہ ”اب آپ کے دوست یعنی ماما“ اوپر ”جانے والے ہیں۔ پاؤں میں درم آگیا ہے۔ چلنے پھرنے سے معدود رہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ماما جانے سے پہلے اطلاع ضرور کر دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سرکاری دورے پر رہوں اور تم سفر عدم پر روانہ ہو جاؤ۔“

ماما نے تو عدم کا سفر ملتوی کر دیا مگر رشید بغیر اطلاع کئے ہوئے اپنی آخری منزل کی طرف چل پڑا۔ کس کو معلوم تھا کہ موت سے چند روز پہلے میا برج کے مشاعرے میں ”آخری نظم“ کے عنوان سے جو نظم پڑھی تھی وہ اس کی آخری نظم ٹھہرے گی۔

ارے ظالم کوئی اس طرح بھی بھرا پر اگھر چھوڑ کر جاتا ہے؟ نہ ماں کی فریاد سنی،
نہ بچیوں کی آہ وزاری پر کان دھرا، نہ بھائی بھتیجیوں کی آہ و بکا پر توجہ دی۔ نہ احباب کی
سکیوں کا احساس، نہ پولس کی آخری سلامی کا پاس۔ نہ عیادت کی زحمت دی، نہ تمارداری
کی تکلیف۔ ”آبنوسی خیال“ کے چھپنے تک کا انتظار نہ کیا۔ اٹھے اور چپکے سے امیر خان مر جوم
کے پہلو میں جائیئے۔ رشید! تم تو بہتر حمدل تھے دوست! اچانک اتنے کٹھور کیسے ہو گئے؟

جس کے دم سے تیری دنیا مصر کا بازار تھی
اے زلینخاۓ سخن تیرا! وہ یوسف مر گیا
افری، دانشوری، تیشه زنی، شیشه گری
جو فرانس اس کے ذمے تھے وہ پورے کر گیا

پروفیسر اعزاز افضل

۷ اگست ۲۰۰۲ء

عین رشید ایک نظر میں

نام : عین رشید خان
تاریخ پیدائش : سیم فروری ۱۹۲۲ء (سرکاری)
نومبر ۱۹۲۳ء (اصلی)
یوم وفات : ۱۰ ستمبر ۲۰۰۷ء
تعلیم : بی اے (آئر ز)
پیشہ : آئی پی ایس (۱۹۶۵)
آخری عہدہ : ڈاکٹر کثر جزل آف پولس (اتچ جی)
پستہ : فلیٹ ۷۲۸، گڑیاہٹ روڈ، کلکتہ ۰۰۰۲۹

تصانیف اور ترجمے

- ۱۔ جدید اردو شاعری۔ ناشر: آئینہ میں، لندن۔ ۱۹۷۲ء
- ۲۔ غالب کے اشعار کا بگلہ ترجمہ۔ ۱۹۹۵ء۔ دوسری ایڈیشن ۱۹۹۸ء
- ۳۔ بگلہ میں عین رشید کی نظموں کا ترجمہ۔ ۱۹۹۲ء
- ۴۔ جاوید اختر کے مجموعہ "ترکش" کا بگلہ ترجمہ۔ ۱۹۹۹ء
- ۵۔ روزانہ *ستلیٹ* میں میں تبصرے اور مضاہیں

فلمیں

- ۱۔ ”استاد امیر خان“۔ پانچویں برسی پر ایک ڈاکو منٹری فلم جو ۱۳ فروری ۱۹۷۹ء کو دوور درشن کے سب اہم اسٹیشنوں سے بیک وقت دکھائی گئی۔
- ۲۔ ”ساتواں آدمی“۔ (ہندستانی مسلمانوں پر فلم) ۱۹۸۱ء
- یہ فلم Leipzig فلم فیٹول، انڈین پیوراما سیکشن ۱۹۸۲ء، فیٹول سنیما، (پیرس) لندن فیٹول میں دکھائی گئی۔
- ۳۔ گوتم گھوش کی فلم Meeting A Mile stone کی اسکرپٹ لکھی اور کمنٹری دی۔ یہ فلم Cannes فلم فیٹول میں افتتاحی فلم کی شکل میں دکھائی گئی۔
- ۴۔ گوتم گھوش کی ۱۹۹۳ء کی انعام یافتہ فلم ”پنگ“ کی اسکرپٹ لکھی۔
- ۵۔ گوتم گھوش کی فلم Beyond the Himalayas (1995) کے لئے کمنٹری دی جو New York B.B.C. Discovery Channel کے فلم فیٹول میں بہترین ڈاکو منٹری ایوارڈ سے نوازی گئی۔
- ۶۔ گوتم گھوش کی فلم ”گڑیا“ (1996) میں سنواد لکھا۔
اس فلم کو بہترین ہندی فلم کے لئے ۱۹۹۷ء میں ایوارڈ دیا گیا۔
- ۷۔ WHO کے لئے کینسر پر گوتم گھوش کی فلم ”شام ہی تو ہے“ (1992-93) کے اسکرپٹ اور کمنٹری کا کام انجام دیا۔
- ۸۔ وجوہتی بھوشن بندھوپاڈھیائے کی کہانی پر گوتم گھوش کی ٹیلی فلم ”فقیر“ (1998) کی کمنٹری لکھی۔

۹۔ غالب کے دو سو سالہ جشن پیدائش کے موقع پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ساہتیہ اکادمی میں منعقد ہونے والے جلسوں اور سینمازوں کو کور کر کے گیارہ گھنٹے کی فلم بنانا شروع کی تھی۔ اس فلم کے اسکرپٹ رائٹر اور ڈائریکٹر عین رشید خان تھے۔ یہ فلم اب تک نامکمل ہے۔

اہم براڈکاست

۱۔ آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی سے مسلسل مختلف عنوانات پر مضمایں اور تقاریر نشر کرتے رہے۔

۲۔ کلکتہ شہر پر ایک فیچر بنا میں ”شہر“ بنایا جسے آل انڈیا ریڈیو کے دو اہم مرکز سے آل انڈیا انعامات ملے۔

۳۔ استاد امیر خان اور ان کے ترانوں پر ایک فیچر۔ اسے بھی نیشنل ایوارڈ ملا۔

۴۔ بی بی سی سے دو اہم موضوعات پر Talk Show نشر ہوئی۔

۵۔ کلکتہ میں اردو پر ایک چار گھنٹے کا فیچر اور ستیہ جیت رائے کے ساتھ ۱۶ گھنٹے کا انشرونیو۔

۶۔ FM پروگرام میں مسلسل فیچر براڈکاست کرتے رہے۔

۷۔ دو در درشن نے عین رشید کی حیات اور کارناموں پر ۳۵ منٹ کی ایک فلم ”صاحبِ فن“ کے نام سے بنائی۔

۸۔ ساہتیہ اکیڈمی کی مطبوعہ Who is who of Indian writers (1990، 1993) میں عین رشید کا نام شامل ہے۔

نظمیں

ہم وہاں دیر سے پہنچے

ہم وہاں دیر سے پہنچے
مگر ہم سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا
عقلمند لوگ تھے

ورنہ ایسی بات ہوتی کہ
کوئی کو لمبی سے پوچھے کہ وہ دو گھنٹے دیر سے کیوں آیا
وہ دن اس سال کا آخری دن تھا
اور ہمارے سفر کا پہلا
غیند اور سفر سے ماؤف
ہمارے جسموں میں
غسلوں کے خواب تھے
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر
تم عزیز ہو؟

یا تمہارے ماتھے پہ چمکتا تابدار ستارہ
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر ہمیں ایک ندی نظر آئی

جو ہماری گاڑی کی طرح
 بے دلی سے سمندر کی طرف جا رہی تھی
 ہماری گاڑی کی بے دلی گھنٹوں میں
 غصے میں تبدیل ہو گئی
 پہنچے گرم اور رک گئے
 ہم نے کیلوں کے پتوں کے اپہار سے
 پھیوں کے غمیض و غصب سے نجات پائی
 ہماری گاڑی اور ندی بے دلی سے
 سمندر کی طرف چلتی رہی
 رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر ہمیں مضبوط جبڑوں والے قدیم لوگ نظر آئے
 جن کے اجداد نے پتھر کاٹ کر مندر بنائے تھے
 لوگ جو کوٹ نہیں پہنچتے تھے اور گوشت نہیں کھاتے
 ہم نے وہاں پہنچے چلائے اور سبزیاں کھائیں
 رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر آثارِ قدیمہ کے ایک کھنڈر میں
 مجھے ایک لڑکی نظر آئی
 جو تاریخ کے اوراق سے نکل کر آئی تھی
 جی میں آیا قریب چاکر دیکھوں کہیں

اس کے بال سفید تو نہیں ہو گئے
مگر ہمارے ساتھ کتنے لوگ تھے
رات کے ہم سفر، شام کے ہم سفر

پھر

ہمیں

سمندر دکھائی دیا
سب خوشی سے چکا ٹھے
چکنے کی بات ہی تھی
سمندر کے اس پار

دنیا

اور پھر

زندگی



شہر

شہر!

لوگ کہتے ہیں کہ تجھ سے تھک جانا

مرجانے کے برابر ہے

..... اور مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے

تو سن شہر، میں تجھ سے صاف صاف کہدوں

..... کہ میں تجھ سے تھک گیا ہوں

یا مجھے یوں لگتا ہے

کہ میرے سر سے اُس باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے

..... جو اتنے دنوں میری نگہبانی کر رہا تھا

سن شہر،

اگر میں مر جاؤں

اور لوگ مجھے دفنانے لے جائیں

تو جھپٹ کے تو مجھے گود میں لے لینا

اور بال کھولے کہانی والی ماوں کی طرح

مجھے آنچل میں پھاپ کر، چیخ چیخ کران سے کہہ دینا:

کہ نہیں یہ میرا بیٹا ہے،

میرے جیتے جی یہ کبھی یتیم نہیں ہو سکتا!

نہ ہی

میرے جیتے جی کوئی اسے مجھ سے چھین سکتا ہے!



شہر

شہر، تو اپنے گندے پاؤں پسارے دریا کے کنارے لیٹا ہے
اور تیرے سینے پر رنگتی ہوئی لا تعداد چیزوں نیاں سورج کو گھور رہی ہیں
جب نصف درجن غیر ملکی حکیموں نے مشترکہ طور پر اعلان کیا
مرض سنگین ہے اور جلدی ہی مر جائے گا
تو کسی چیک زدہ بچے کی طرح تو نے انہیں دیکھا اور خاموش ہو رہا
غایظ! بدکار! بے رحم!

شہر! لوگ کہتے ہیں کہ تو بدکار ہے
اور میں نے خود دیکھا ہے کہ

سر شام

تیرے رنگے چہرے والی عورتیں لڑکھراتے نوجوانوں کو نگل جاتی ہیں
بے رحم!

جب رات گئے تیرے دانشور کشائے خود کشی کرنے جاتے ہیں
تو خاموش ہو رہتا ہے!

شہر، میں تیری دیوانہ کن خواہشوں سے بیزار ہوں
شہر، تو اپنے گندے لباس کب اُتارے گا؟
شہر، لوگ کہتے ہیں، مرنے کے بعد میری ہڈیوں سے بُٹن بنائیں گے!
شہر، تیری دیواروں پر یہ کیسی تحریر ہیں ہیں؟
شہر، میں نے مہینوں سے اخبار نہیں پڑھا!
شہر، تو چائے میں شکر ملانا بھول گیا ہے اور اب یہ تیرے آنسوؤں کی طرح لگ رہی
ہے!
شہر، مجھے نیند آرہی ہے، تھپک کر سلاادے!

۔۔۔

شہر

آئے

ہم اس شہر میں
تجھیز و تکفین کے لئے آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں
ہمارے کارکنوں کی انتظامیہ صلاحیت سارے علاقوں میں مشہور ہے
ہمارے گزشتہ گاہوں کی فہرست طویل، غیر معمولی اور موثر ہے
ہمارے مرمریں کتبوں کا جواب نہیں
نوحہ خوانوں کا انتظام بھی ہم ہی کریں گے
دعاۓ مغفرت کے لئے بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں
ہمارے کارکن وہاں بھی موجود ہیں
ہم آپ کو یہ بتادیں کہ ہمارے دام معقول اور مناسب ہیں
اور

اس موسم میں
نہایت ہی کم قیمت پر
پاؤں پھیلانے کو
ایک پر سکون گوشے کی یہ پیش کش صرف
دوستوں اور نیک لوگوں کے لئے ہے



شہر

اس موسم میں یہاں صرف خداوں کی بود و باش ہے
جو سرخ ہواوں اور چنگھاڑتی دھوپ کی زبان سمجھتے ہیں
گبیھر لے میں گامزن دھوپ
و باکی طرح گھروں اور بخیر مید انوں میں پھیل گئی ہے
ہر طرف سائیں سائیں کرتی تاریکی ہے
حد تگاہ تک

پلکوں پر لرزتے گرم قطروں کے سوا کچھ بھی نہیں

دُور

تاریکوں کی ہم سائیگی میں
پالتو اور نیم و حشی کبوتر
فن نامہ بری سیکھ رہے ہیں
تاریکی اور حرارت سے مانوس آسیب زده لوگ
برق خور کوؤں کی آواز کے منتظر ہیں!



آبنویں خیال

نہیں، میری جان فضا خراب ہے تو گاڑی پار کر دو
باہر جانا مناسب نہیں،
اُداس قہقہوں میں پلے نچے اب جوان ہو چلے ہیں
اور ہیڈ لائیٹوں کی روشنی میں نئے غمتوں کی ایجاد کر رہے ہیں

ہم اُس میجاکی آمد کے آثار کے منتظر ہی رہے
پھر سڑکوں پر چند طوائفیں نظر آئیں
شاید وہ نظر آگیا ہے!
ہاں، ہاں، طوائفوں نے لچائی آواز میں کہا
”چلو ہمیں اپنی گاڑیوں میں لے چلو!“

درخت آبنویں خیالوں میں مد غم رہے!

جب اُس نے گلے سے لکھتا ما سیکر و فون پر کئی دن تک چیخ چیخ کر کہا کہ میں میجاہوں
تو ادارہ امداد بآہمی والوں نے اُسے کھانے پر بلایا

کھاپی کر اس نے تقریبی
 گرد گرد اکر کہا میں مسیحا ہوں مجھے صلیب پر لٹکا دو!
 لوگوں نے واپسی کا کراچیہ دے کر اسے رخصت کر دیا

اور اس سال ہماری فصلوں کو منڈیاں کھائیں
 اس سال ہم نے ندامت کے روزے رکھے
 اور کھاتے بھی کیا کچھ تھا ہی نہیں!

تمام پیغمبروں اور مسیحاؤں کو جیل سے رہا کر دیا گیا
 ۳۸۰۰۰ پیغمبر اور ۶۷ مسیحا

سرکوں پر منڈلاتے رہے اور تقریبیں کرتے رہے
 ”انسان کے بیٹو! ہم صدیوں سے ٹوٹی کر چیس چن رہے ہیں
 اب ان کر چوں سے تمہارے لئے ایک نئی کائنات کی تخلیق کریں گے
 اور تمہارے ہاتھوں سے اجنبی اسلوے کر پھر سے تمہیں پھر دے دیں گے!“

اور ٹوٹی کر چیس چھتے رہے!

وہ بچہ جو ہمیں صحیح کا اخبار دے جاتا یک بیک غائب ہو گیا
 ہمارے دودھ والے نے بھی آنا بند کر دیا

ہم سب ٹوٹی کر چیس چھتے رہے

پھر

ایک صحیح

وہ لڑکا

صحیح کا تازہ اخبار لئے نمودار ہوا

دودھ والا بالٹی لئے دروازے پر کھڑا مُکار ہاتھا

جیلیں پھر بھردی گئیں!



میرے بعد آ

بدلے گارنگِ شامِ الٰم

میرے بعد آ

ہو گا ذر اساد رو بھی کم

میرے بعد آ

تہائیاں بھی اپنی ہیں

اپنی ہیں ساعتیں

خود ساختہ ہیں سارے یہ غم

میرے بعد آ

خوابوں کی اُس منڈیر سے دیکھا کئے مجھے

یہ اور بات ہے کہ ہوئی چشمِ میری نم

نمنا کیوں کی بات ختم

میرے بعد آ

ہر یالیوں کی بھیڑ

مگر دکھ کی کاشت ہے

بدلے گارنگ چرخ کہن

میرے بعد آ



قسطوں میں خواب

میں جب چھوٹا تھا
تو چلتے چلتے خواب دیکھا کرتا تھا
اکثر میں صرف خواب دیکھنے کے لئے ہی چلتا تھا
صحیح کو، دوپہر کو، شام کو
رات کو گھری نیند سوتا تھا
جو گھرے نیند سوتے ہیں وہ خواب نہیں دیکھتے
سارے خوابوں کا مرکزی کردار میں ہی ہوا کرتا تھا
مگر میرے قریبی اور پیارے لوگ بھی اُس میں شامل رہتے تھے
میرے خواب طویل اور منظوم ہوتے تھے
اور میں اکثر ان میں ترمیم کیا کرتا تھا
کچھ خواب (جودل کونہ بھاتے تھے)
انہیں چھوڑ کرنے خواب کی شروعات کرتا تھا
اب میں رات بھر
اور خاص کر صحیح کو

قتلوں میں خواب دیکھتا ہوں
 ادھ جلے خواب
 کچھ خوابوں سے نجات ملتی ہے
 تو جی خوش ہو جاتا ہے
 سارے خواب جانے پہچانے ہوتے ہیں

مانوس خواب
 تفصیلی خواب
 کچھ خواب روز مرہ تفصیلیوں سے واضح
 کچھ سہانے خواب جب رُک جاتے ہیں
 تو انہیں دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں
 خواب خود نہیں دُھراتے

آن دیکھے خواب
 اب خوابوں کی دنیا میں ہیں



بیڑیاں

ہر رات

اک ہجوم

پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کو بے قرار

ہر رات

بیڑیاں

پاؤں کو نگل جاتی ہیں

صرف بائیس کو حرکت کی اجازت ہے

دایاں بیڑیوں میں محفوظ ہے

اگر بیڑیاں پاؤں نہ نگلیں تو

آن سروں کا کیا ہو گا جو پاؤں کے بل کھڑے ہیں؟



۲۰ نومبر ۱۹۹۱ء

عینی بیٹی۔۔۔ دعا

برائے عقیلہ عینی انو بنت شمشیر انور

کتنی خوش لگتی ہے تو
کہ تیرے کوئی سمجھوتے نہیں
تو خوش رہے یہ سب کی خواہش ہے
تو خوش رہے گی
مگر

زندگی سے کھیلے گی
یہ دعائیں
یہ دل کی باتیں ہیں
اگر قبول ہوئیں
دنیا میں

تیرا مقام مختلف ہو گا
تو اس صدی سے کبھی اُس صدی سے کھیلے گی
مگر

سب سے الگ
یہی دعا ہے مری
کہ اس صدی کے گنجالوں کی گود میں پل کر
تو اس صدی کے اجالوں سے چکا چوندنا ہو

.....

کھلے ہیں پھول پھر

کھلے ہیں پھول پھر

ہر باؤ فا کو دعوت آوارگی پھر ہے

زرم، نیلے پروں کو پھر پھڑانے کی اجازت

دیر تک ہے اب

ذرما کچھ دور ہے

پلکوں سانیلا

خوبصورت گاؤں



زَرْدِ پَتَّے

ڈھیر میں
خاموش
سوئے تھے
وہ سب
یک بیک
جگش ہوئی
جائے سمجھی
پھر
شرارت سے
ہوا میں
تیرنے، اڑنے لگے
”مُخْبَر و بھائی، کون ہو؟“
آئے تھے
کیوں؟
”اور کیوں چلے؟“ میں نے کہا
”پتے۔ پتے، پتے ہیں“

اٹھلا کے وہ کہنے لگے

”ہم یہاں

ایک خوبصورت خواب

آنکھوں میں جگائے

سور ہے تھے

کہ کوئی فنا کر

شہرے، زرد اور بھورے رنگوں میں

ڈھال دے ہم کو

کہ

ہر پشم بینا کے لئے

جب کوئی آیا نہیں

جاتے ہیں ہم۔“



سمندر کا خیال

اپنی دہلیز پہ کھڑا تہنا
اپنا گھر اجنبی سالگتا تھا
اس کی رخصت تھی مانند پرواز
ہر طرف ابتری کا منظر تھا
ایک لکنت زده سی ویرانی
درو دیوار پہ تھی حیرانی
لرزتے آنسو اور دکھتا ہوا سر
روکتے تھے اسے پیاس ویرانی سے
وہ کہ سویا ہے یا کہ جاگا ہے؟
صح سے کیوں یہ سمندر کا خیال ذہن میں آج تپھیرے مارے؟
کھر آلو دیند دریکوں میں
جب و سعی کائنات چھپتی ہے
نا امیدی کی نیلگاؤں چادر ایک سمندر سی پھیل جاتی ہے۔
کیوں یہ رہ رہ کے سمندر کا خیال ذہن میں آج تپھیرے مارے؟
کتنی مانوس تھی، قریب تھی وہ

جیسے ساحل ہوا ک سمندر سے
 بے کر اں مونج جیسے ساحل کی گود میں آ کے ہی دم لیتی ہے
 اُس کی تصورِ اُس کے ہلتے لب
 سارے منظر ہیں زیر آب کہیں
 اک تلاطم کے بعد سر کنڈے
 جیسے پاتال میں چھپ جاتے ہیں
 کیوں یہ رہ رہ کے سمندر کا خیال ذہن میں آج تھیڑے مارے؟
 شام کے دودھیا دھنڈ لکوں میں
 تنہا تنہا اداں پھرتا ہے
 رات جب سکیوں میں ڈھلتی ہے
 پھر سمندر کی یاد آتی ہے

یہ حیں وادیاں اس سے مانوس تھیں، اس کی جا گیر تھیں
 ایک طوفان پیغم ہوا میں خروش
 سب حیں وادیاں یک بیک سو گئیں



ہم سفر

اک سفر کی شروعات ہو سکتی ہے
تم اگر ہاں کہو، تم اگر ہاں کہو
شہرا ہوں میں گلیوں میں بھٹکیں گے ہم
کوئی منزل نہ ہونہ ہو زادِ سفر
ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر

اور بننے میں تم کو مہارت تو ہے
خواب بننے چلیں گے
ڈگر سے ڈگر
تم اگر ہاں کہو، تم اگر ہاں کہو
ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر

تلخیاں زندگی کی بکھر جائیں گی
اور پر چھائیاں بھی نظر آئیں گی
غم سمت جائے گا
رات کڑوے ہلکی میں گھل جائے گی
تم اگر ہاں کہو، تم اگر ہاں کہو
ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر، ہم سفر



۱۳۱ / دسمبر

ایک اور سال بیت گیا اضطراب کا
ایک اور شام ڈھل گئی بے چینیوں کی آج
ایک اور دن کی شام کسی طرح ہو گئی
”پچھے دے دلا کے حال کو ماضی بنادیا“



بیمار گڑیا

کہ شاید خزاں چھوگئی اے

آج خاموش ہے

چل کے دیکھیں کہیں

آج پھر زیرِ دل

ایک معصوم خواہش کی شدت نہ ہو

پھر کسی ادھ جلے خواب کی جستجو تو نہیں

تلیاں، سبز و نیلیں

سر پھرے رقص و بو کے جہاں سے

کتنی مانوس و سرشار ہیں

اور میں اپنے اچھے خدا سے

کتنی بیزار ہوں

تھک گئی ہوں

چاند تاروں کو چھونے کی خواہش

چوٹیوں تک پہنچنے کی خواہش

ایک بے نغمہ بے ساز و سعت

دل دھڑکنے سے بھی بچکاۓ

صورت دود سایہ گریزاں
 نسلی تاریکیوں سے شلغفتہ
 قہقہے مارتی میں جو نکلی
 میرے خوابوں کے بیدار چہرے
 سارے ساحل پہ نوحہ خواں ہیں



کون ہے تو؟

سا یہ میرا مجھ کو دیکھ کے بھاگے ہے
پھر بھی میرے ساتھ رہے ہے
کون ہے تو؟

ابھی قربت ہی زیست کا باعث ہے
پھر بھی تجھ سے ڈر ہی لگے ہے
کون ہے تو؟

تجھ کو دیکھ کے پیار سے دل بھر آئے کبھی
دو جے لمحہ دل رجے ہے
کون ہے تو؟

تیرے من کی باتیں من کی باتیں ہیں
پھر بھی من کی بات نہ سمجھئے
کون ہے تو؟

راز کی ساری باتیں تجھ سے کرلوں میں
پھر بھی جی کا حال چھپاؤں
کون ہے تو؟

شرم سے سر جھک جائے جب بھی آئے تو
پھر بھی دل کے پاس رہے ہے
کون ہے تو؟

تیری سانسوں کا موسم ہی موسم ہے
غیروں کا موسم ہی لگے ہے
کون ہے تو؟

تجھ کو دیکھ کے لب خشک ہو جائیں کبھی
باتیں کرنے کو دلتے ہے
کون ہے تو ہے؟

جھک کے جب بھی دیکھوں اپنی لگتی ہے
پھر بھی مجھ سے دور رہے ہے
کون ہے تو؟



رات اور صبح

موت کی جو
صرف شمشانوں، قبرستانوں
ہسپتاں
لوبان یا اگر بُتی میں نہیں ہوتی

موت کی جو
آستینوں
اور ناف کے نیچے چھپی رہتی ہے
ہمیں موت کی بھبک
اس بڑھیا کی آنکھوں میں ملی تھی
جو اپنے جوان پوتے کا انتظار
اُن یہجانی دنوں میں
چورا ہے پر کرتی تھی
اور ٹک ٹک ہمیں تکتی اور پوچھتی تھی
کہ بابا کب آئے گا

ہم سب اُس کو دلا سہ دیتے تھے کہ
وہ جلد ہی واپس آجائے گا
حالانکہ ہم جانتے تھے کہ
وہ کہیں اور ہے

گھر کے آنگن میں
اُس نوجوان کی ماں
جو اپنی ساس سے
چالیس سال زیادہ ادا س تھی
اُس آنگن میں موت کی بُو تھی

ہم چپ چاپ اُس نوجوان دوست کو تکتے رہے
جس کے بے کار لب اب کچھ نہ کہیں گے
نہ ہی وہ ہماری سر گوشیاں سن سکے گا

رات

پُرانے دکھوں کی طرح

بے جس اور زندہ

دُور

خاموشی

کسی بے چین روح کی طرح

چپ چاپ اور سہی ہوئی

پھر ہم بے بسی اور

عجز و انگسار سے سانس لیتی

رات کو تکتے رہے

زرد پتوں اور فنا سے بنائی ہوئی رات

پھر ایک اضطرابی صبح

(جو یک بیک نازل ہو گی)

اور موت کے پس منظر میں
 ہر چیز کو واضح کرے گی
 بندوں کا نیں
 ہر اسال لوگ
 سُنسانِ محکے
 ستائوں

اور بے گھروں کے گھروں میں
 موت کی مزید تیاری میں مشغول
 موت کی سلطنت کے
 جواں مرد سپاہی
 موت ان کی آنکھیں لئے
 صبح و شام تک ہمارے ساتھ رہتی ہے
 ایک گناہ
 ایک بے وقوف جرم
 یا ملامتِ ضمیر کی طرح !



سَرکش

باز کی طرح جھپٹا وہ برہم فرشتہ
اُس کے بالوں کو مُٹھی میں جکڑے ہوئے اس سے بولا
”میں تمہارا فرشتہ ہوں سن لو
اپنے سارے فرائض تم انجام دو گے
میری مرضی ہے یہ
یہ کاروں، غریبوں، احمدقوں سے
ہمیشہ پیار کرنا۔ تم ہمیشہ پیار کرنا
تاکہ جب آئیں انسانیت کے مسیحا
فتح کا سرخ قالین ان کے لئے
اپنے اخلاق سے ٹھم بنو
اس سے پہلے کہ تم خود سے بیزار ہو
اُس کی عظمت سے دل کو منور کرو
اوچ عشرت ہے یہ، اوچ عشرت ہے یہ
دیرپا، دیرپا، دیرپا، دیرپا
درست الفت

دل دھڑکنے سے بچ کچائے
 صورتِ دود سایہ گریزاں
 نسلی تاریکیوں سے شگفتہ
 قہقہے مارتی میں جو نکلی
 میرے خوابوں کے بیدار چہرے
 سارے ساحل پہ نوحہ خواں ہیں



پہلا دائرہ

ہر طرف رات ہے
پھر میلی رات
بے نواچینوں کے سناٹے ہیں
اندھیرا ہے
برق بے نور
کسی زخمی پر ندے کی طرح
سر پتلتی ہے، ذرا اڑتی ہے
گرجاتی ہے
سرد آہوں میں پکھلتی ہوئی لرزیدہ ہوا
وست بست کسی مجرم کی طرح سہی ہوئی
کانپتی چلتی ہے دو گام
نہبڑ جاتی ہے
کیسا صحراء ہے یہ
کھوئی ہوئی آنکھوں کا ہجوم
اتنی سونی کہ نظر آئیں

رہ گزارِ حیات
 اتنی مغموم
 کہ ان پر زندگی کا گماں
 کیسا دوزخ ہے
 یہاں ظلم نہیں آگ نہیں
 کون سے لوگ ہیں؟
 امیدوں کی صورت کیا ہے؟



سیب اور مُصوّر

ایک بالکل گول طشتہ ری پر

ایک سیب بیٹھا ہے

اور اُس کے مقابل

حقیقوں کا مصور

سیب کی حقیقی تصویر بنانے کی ناکام کوششیں کر رہا ہے

کمجنگ سیب ہے کہ رنگوں میں ڈھلتا ہی نہیں

اس معاملے میں اُس کی اپنی رائے ہے

(ذرا مختلف قسم کی)

مصور پر رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

سیب اُس کا دشمن ہے

پھر وہ بے چارہ خیالات کے

ناہیں والے جال میں پھنس جاتا ہے

پھر اُس کے ذہن میں سیب کا ایک درخت آتا ہے

پھر جست

پھر ہاتھ میں برائندی کا گلاس لئے سانپ

پھر آدم

پھر حوا

اور پھر گناہ اول

اور پھر اسے محسوس ہوتا ہے سب یک بیک غائب ہو گیا ہے
اور پھر

اُسے نیند آ جاتی ہے



کتبہ

چشم ور خسار اشکوں سے نم

پیچھے چلتے رہے

ساتھ لیتا گیا

نیلگوں کا سانج اور درختوں کا قد

(موت پر استاد امیر خاں کی) ۱۳ فروری ۱۹۷۲ء



ایک لوری — صرف اپنے لئے

آہان نیلا ہے
دھرتی تو بھرتی ہے
راجا میٹے
جتنا جی چاہے اب سو جا

خوابوں کی دنیا میں
شہزادی پریاں ہیں
اُن کی پناہوں میں
اُن کی ہی بانہوں میں
سیانے بیٹے
جتنا جی چاہے اب سو جا



اسلامی جنتری کا پہلا دن

دال اچھی ہے
لڑکیاں نوری
سخت انداز میں بھی نرمی ہے
مسکرا میں
برق سی ہو نٹوں میں
لہراتی ہنسی

کیا ہوا؟ کیسا ہوں میں؟
اب کوئی دلچسپی نہیں
سہ دہائی کالا ابالی پن
کچھ نہ کچھ تو مشین بولے گی
جسم بولے گا، سانس بولے گی

لمحوں کی خاموشی، تشویش، ہنسی بولے گی
اب اے تصویرِ اجل
مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

سب کہ مانوس ہو گئے مجھ سے
چارہ گر اور نورائیں
ساری تفتیشوں میں مشینوں کی زد

ساتویں دن کی دوپہر کو سب
ایسے آئے کہ بیٹی رخصت ہو
ایک ڈاکٹر جو مجھ سے چھوٹا تھا
(اور اس طرح کی زندگی سے واقف تھا) اس نے کہا:
”سے دہائی کی یہ دحشت، یہ لا ابالی پن
جو تم نے پالی ہے
اس میں ہم ہی نہیں
ہماری مشینیں بھی حیران ہیں“
میں نے کہا۔ ”اے چارہ گر
ایک خلش ہی جگر بچاتی ہے
چاہے وہ نیم کش ہو یا وا آنکھیں“
پھر بڑے ڈاکٹرنے مجھ سے کہا:
”اب بھی سب ٹھیک ٹھاک ہے لیکن
وہ غالب کا ترجمہ ہے کہاں؟“
میں نے دھیمے سے کہا (کسی مجرم کی طرح)
”اب کبھی اس گلی میں نہ بھکلوں گا
نہ شاعری نہ خط نویسی میں“

دُور پنچھی ہے میری رسوائی“
 دونوں ہاتھوں کو کاندھے پر رکھ کر اس نے کہا:
 ”سن شاعر! سن اے حاس بشر!
 اے مجرم!
 تیری ہے سزا
 کہ جتھے معمولی پناہوں میں ہی
 جینا ہو گا۔“



کون ہے اپنا ۹

سوچو تو کون ہے اپنا؟

دنیا ساری ان کی دنیا

اپنی دنیا دکھ کی دنیا

سوچو تو کون ہے اپنا؟

سب ہی مگن ہیں اپنے سکھ میں

ہم جیتے ہیں پالے دکھ میں

سوچو تو کون ہے اپنا؟

خوابوں کی دنیا میں اکیلے

ہم ہی نہیں تھے تنہا نہیں تھے

ساتھ تھے اپنے خواب ادھورے
 سوچو تو کون ہے اپنا؟
 دکھ جب ہم کو دیئے گئے تھے
 لوگ ہمارے کہاں گئے تھے
 سوچو تو کون ہے اپنا؟
 تم بھی یہاں ہو ہم بھی یہیں ہیں
 پھر بھی اتنی دوری کیسی؟ کیسی دوری؟
 سوچو تو کون ہے اپنا؟
 اپنالو اپنالو ہم کو
 پیار کے سارے بھوکے ہیں ہم
 نا ہے تم کو ہمدردی ہے
 سوچو تو کون ہے اپنا؟



دردِ تبسم

”باغِ تجھہِ بن گل زگس سے ڈراتا ہے مجھے
نکلوں جو سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے“ غالباً
”کون اس دردِ تبسم سے بچاتا ہے مجھے
آخری وقت ہے وہ دیکھنے آتا ہے مجھے“
”دمِ تحریرِ معین تھے دو فرشتے بھی
وادِ ہمت کی، کہ وہ آنکھ دکھاتا ہے مجھے“
سرسری طور کہ، ہم اس جہاں سے گزرے
پھر بھی وہ، دین و دنیا سے ڈراتا ہے مجھے“
میں جگر پار گزروں گا اشاروں سے پرے
وہ کہ ان چاند ستاروں سے ہنساتا ہے مجھے
اپنی خواہش، نہ تمنا، نہ جمیشِ انگشت
آئے اب جسکے لئے اب وہ ستاتا ہے مجھے
حیرتِ فکر سے غافل رہا دل،
پس زانوئے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے



چُپ رہو

”بے طلب وہ دے رہا ہے چُپ رہو

کچھ کہا تو بات خالی جائے گی“

چُپ رہو، چُپ رہو

آنکھ کھولو، چُپ چاپ رہو

اُس کی سنو

یادوں کا دامن پکڑو

گُن گُن کی آواز سنو

دور پیہا گاتا ہے

اُس کی سنو،

چُپ چاپ رہو

آہستہ، آہستہ چلو

گول سا ایک پتھر دیکھو

لاکھ سال سے چاند ستارے

جس کو دیکھ کے چلتے ہیں

اُس کو دیکھو

کچھ نہ کہو

پتھر وہ پتھر اس منٹھنی میں آئے گا

پھر تم کو سہلائے گا
 دُھنک کے گیت نائے گا
 آنکھیں کھولو
 دھیرے چلو، آہستہ چلو
 شبِ نم کے سارے قطرے
 افق کو جا کے چھولیں گے
 دل میں جگنو جگ مگ مگ گائیں گے
 جیسے ہی مٹھی کھولو گے پھر اڑ کر
 اک طائر بن جائے گا

چپ رہو، چپ چاپ رہو
 آنکھیں کھولے
 مٹھی جکڑے
 اُس کی بنو
 ”کچھ کہا تو بات خالی جائے گی“



مُہرِ سکوت

کچھ ہی دیر بعد میری یہ سواری آنکھوں سے او جھل ہو جائے گی
اور میں اس کا تنہا اور آخری سوار ہوں گا
مجھے معلوم نہیں، سواری کون لے جارہے ہیں
شاید کچھ لوگوں سے میں کبھی نہ ملا ہوں
مگر وہ نہایت ہی سنجل سنجل کے مجھے لے جارہے ہیں
جیسے مجھے مدت سے پہچانتے ہوں یا شاید میں نے ضرور کبھی
آنہیں مسکرانے یا ہنسنے کا موقع دیا ہو گا
وہ گھاکے دہانے تک نہایت ہی احتیاط سے مجھے لے جاتے ہیں
مگر اب کسی کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں
اب وہ مجھے کوئی تحفہ بھی نہیں دے سکتے
پوٹلی میں زادِ سفر کچھ بھی نہیں

میں ان بے کسوں میں ہوں جنہیں چڑھے کپڑے بھی میسر نہیں
صرف چہرے پر کچھ تحریریں ہیں (خود میرے لکھے ہوئے)
جنہیں کوئی نہیں پڑھ سکتا

اگر زندگی میں اتنے چیز و خم ہیں
 تو میں کیوں کھلی کتاب بنوں؟
 نہ ہی میں نے کسی کی زندگی کو واضح طور پر سمجھنے کی کوشش کی
 اس خونی صدی میں لکھی تحریریں
 خود میرے خون سے لکھی تحریروں پر دل کی دھڑکنوں
 کی ساکت مہر ہے
 یہ واحد مہر ہے جسے کوئی بھی نہیں توڑ سکتا

۔۔۔

تاریخ کی الٹی طرف

نہیں! میں کسی یونانی الیے کا مرکزی کردار نہیں
نہ ہی میں اس لئے بنا تھا..... میں تو ایک خاموش تماشائی ہوں!

ہزاروں سال پھر وہ میں جکڑے کسی مرکزی کردار کی آنکھیں
جب شاہین سے ٹُچوائی جاتی ہیں
اور جب وہ درد سے کراہ کرتا ہے ”میں پیار کرنے والوں کیلئے ایک کربنائ
منظر ہوں (۱) !“

یا سالہا سال سمندروں میں بھٹکنے والے سیاحوں سے
خدا جب ان کے گھر آنے کا دن چھین لیتا ہے (۲)
یا جب کوئی سرکش مرکزی یونانی کردار
اپنے آبائی خدا سے مسکرا کر کرتا ہے۔ ”تجھیق کے بعد مجھ پر تمہارا کوئی حق
نہیں رہا۔ (۳) !“

تو میں اپنے بغل والے معصوم تماشائی سے
ماچس مانگ کر اپنا سگریٹ سلاگا لیتا ہوں ”خدایا ! یہ لوگ کتنے بے وقوف
ہیں (۴) !“

مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں
 شاید اپنی غلطیوں کو ہنس کر بھولنے کے فقدان کو تجربہ کہتے ہیں،
 یا پھر شاید اسی اختلاجِ کمتری کوذہن کے فرتع میں بند رکھنے کو !
 شاید..... مجھے معلوم نہیں !

یہ صدی درِ دیز چلی سے کراہ رہی ہے
 اور میں تاریخ کے شاطرانہ صحن میں بیٹھا سوچ رہا ہوں
 ”میں نہیں، یہ دنیا ضعیف ہو گئی ہے اور جلد ہی مر جائے گی۔“ (۵)
 مگر مور خین میرے بارے میں کیا لکھیں گے ؟

(۱) ایس کلس، (۲) ہومر، (۳) سارتر، (۴) شیکسپیر اور (۵) ایڈر راپاؤنڈ



نرگس اور باز گشت

ہزاروں سال سے اُسکی بجھی آنکھیں
پُر نم ہیں
اس مر لعش پکر کے لئے
جس کا عکس
جمیل کے شیتل جل کی لہروں میں
مر لعش ہے
چمن میں کوئی دیدہ و رپیدا ہو یا نہ ہو
بھلا اس سے اُس کا کیا لینادینا
اور فضائیں صرف ڈیڑھ جملے گونج رہے ہیں
”غبارِ عشق میں تنہاؤٹھا کے لا یا ہوں“
اور باز گشت تنہاؤٹھا کے لا یا ہوں
لا یا ہوں ، لا یا ہوں



جانا یانہ جانا

(۱)

ادھر ادھر بکھرے درو دیوار
لہروں میں بستے ننکوں میں
کس کو پکڑوں، کس سے کروں انکار
پیار بھرے خط سارے نکڑے نکڑے
دل کو تھی تھوڑی سی دل جمعی
ویرانی کے منظر جی نہ بھائیں

(۲)

آنکھیں بھاتی ہریاں
بھوکی ڈھول
تختیوں کی تعمیروں میں پربت بھی مشغول
آکاشوں میں میکھر چیں گھنگھوڑ
پگلی ہوا میں کیوں نہ مچائیں شور
جانہ سکا میں، ہوانہ میرا جانا
ہوانہ میرا جانا، جانہ سکا میں، ہوانہ میرا جانا
آن چاہت سے بے چینی تھی کم
جیسے آگ اور پانی
آپس میں مدد غم

باتیں نہتے نہتے
بنی ایک اور بات
آغوش میں
چھپی ہوئی ایک گھاٹ

(۳)

اُدھ جلی دوپہر
چاند سے جھلسی رات
اس رستے اور اُس رستے
روزن پُرات پات
بھوک لگے تو حلق منائے سوگ
املی کے پتوں پر سوئے
ساز ہے سترہ لوگ

گیا پیار سے کوئی ایک بھرمار
کسی نے پھینکے اپنے بس ہتھیار
ملا کسی کو آخری اپنا سپنا
ہونہ سکا پھر میرا جانا
ہوانہ میرا جانا



سچ میں جکڑا ابھیمان

کیا انھیں ہاتھوں نے چھواتھا

نیرا کا وہ چہرہ

جواب گناہوں میں مشغول ہیں؟

شام کی آخری ساعتوں کے گرد آلو دبر آمدے پر
اسی چہرے پر پڑی تھی
ہمت کی ایک تابناک روشنی
جیسے ایک شیلی گرام
طلسمی نیرا پر روشن گام
آنکھوں اور بھنوں سے ملی جلی ایک مسکراہٹ
یا اس کی بھنوں سے لپٹے تابدار قطرے
جب اس جوان کو کمن کہنے کو جی چاہے

(۲)

پھر میں دایاں اٹھا۔ ہوں
 مردانے طرف
 خود سے کہتا ہوں
 قابل ہو
 کم از کم
 اس قابل ہو
 کہ شفقت سے چھولو
 نیرا کے چاہِ ذقن

انھیں لبوں نے کہا تھا نیرا سے
 کہ مجھ کو تم سے پیار ہے
 کیا ان لبوں کو
 راس آئے گا
 کبھی کوئی جھوٹ
 زینوں سے اترتے
 خیال آیا
 کہ ضروری بات تو ہوئی ہی نہیں
 نہ دھونی میں اس لاغر کو
 لے اڑیں گی

(۳)

غیر ملکی اجنبی ہوا میں
 پھر ایک آن دیکھے
 زر لے کی پناہوں میں
 تمام زینے
 یک بیک سہم کر
 نیرا کی آنکھیں
 پیار کی مختلف صورتیں
 جیسے
 چاروں اور
 مایاؤں کی ڈور
 سچ میں جکڑے ابھیمان
 زینوں پہ کھڑا
 آنکھیں شعلوں سے بھرپور
 انھیں لبوں نے کہا تھا نیرا سے
 کہ مجھ کو تم سے پیار ہے
 کیا ان لبوں کو
 راس آئے گا
 کبھی کوئی جھوٹ؟



ماں تم کیوں ناراض ہو مجھ سے ۹

تم نے کہا تھا
دیکھو بیٹے !

بائیں چلنا
جھک کے ملنا
اچھی باتیں ہیں

میں نے دیکھا
جھک کے ملنا
بائیں چلنا
کیسی باتیں ہوتی ہیں
ماں تم کیوں ناراض ہو مجھ سے

تم نے کہا تھا خواب نگر کے سارے ستارے
اپنی ڈگر میں آئیں گے

میں نے دیکھا
خواب نگر کے سارے ستارے
کن کی ڈگر میں آئے تھے

ماں تم کیوں ناراض ہو مجھ سے؟



آخری نظم

”کتابوں کی وجہ سے
میں نے دنیا اور زندگی کو کھو دیا“
اب میں معری اور غیر معری بھروسے تھک گیا ہوں
پیکر تراشی میں کوئی دلچسپی نہیں
مفلونج استعاروں سے جی گھبرا تا ہے
سب مہمل اور بے جان ہیں
دنیا کی کسی بھی جاندار شے کو (چاہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی)
ان بیساکھیوں کی ضرورت نہیں
خوبصورت ترین نظمیں
زندگی کی زندہ اور نبتاب جاؤید خوبصورتیاں پھرانے میں مشغول ہیں
ایک فاختہ سریلی آواز میں اپنے ہم سفر کو بُلارہی ہے
یا ایک کوئل کسی سے ملنے کو بے چین ہے
بچے درختوں کے نیچے میلے پھل پھن رہے ہیں اور تالیاں بخارہے ہیں
سہاگ رات میں کوئی شرما کے اپنی بانہوں میں سمٹ رہی ہے

ایک نوجوان جوزا

دنیا و مافیہا سے بے خبر

بوس و کنار میں مد غم ہے
 اور یہ سب کام میں کسی اُو شاعر کی طرح
 کاغذ پر کرتا ہوں
 اور اسی بیو قوفی نے مجھے
 زندگی کی خوشیوں اور پیار کے لمس سے دور دور رکھا ہے
 میں نے میلوں لمبی پلاش کی جلتی قطاریں دیکھی ہیں
 اور پہاڑوں پر گامزون Orchid کا ہجوم
 بارہا میں نے "س" پہ "ش" گاتی کو ملتوں کی آواز سنی ہے
 اور خدا معاف کرے
 میں نے اپنے پُر کھوں کی بیو قوف پر پرا کو اپنانے کے چکر میں
 انہیں قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے
 اور اپنی ذاتی استعداد کا رعب جمانے کے لئے
 ان میں ترمیم کی جدوجہد کی ہے
 (اور خدا اس گناہ کو معاف کرے)
 میں نے انہیں استعاروں، پیکروں اور اسلوب میں
 ڈھانلنے کی کوششیں بھی کی ہیں
 اور اکثر جب تیری دی ہوئی ذہنی صلاحیت نے ساتھ نہیں دیا..... نعوذ بالله
 تو میں نے یہن الاقوامی سطح پر انہیں ڈھونڈنکانے کی سر مغزیاں بھی کی ہیں
 اور ہمیشہ خود فربی کی معمولی پناہوں میں

خود کو یہ دلasse دیا ہے کہ
 جب پھول اور درخت سب ناپید ہو جائے گے
 اور نو خیز جوڑے منظر سے سرک جائیں گے
 دن گدلا ہو جائے گا اور شام میں ملکجی ہو جائیں گی
 تو شیشے کی الماریوں میں بند میرے یہ جلا وطن الفاظ
 ان کہانیوں کو پھر دھرا میں گے
 تو اس وقت بھی میں اپنے پرکھوں اور ہم عصر یو قوف شاعر کی طرح
 کم ذہنی اور مسخرے پن کا مظاہرہ کروں گا
 جب سورج سوانیزے پر ہو گا تو
 تو ہر ہو شیار آدمی اور ان گنت یو قوف شاعروں کی
 زبان پر صرف ایک ہی لفظ ہو گا
 نفسی اور نفسی
 تو پھر کیا؟ اسرافیل کی بے سُری پھونک سے
 یہ سُریلی نظمیں بھی جاگ اٹھیں گی؟

اور خدا یا میرے ان مشہور مصوّر دوستوں کا کیا ہو گا
 ان کی درگت کا خیال آتے ہی جی لرز جاتا ہے
 (بالآخر تو وہ میرے دوست ہیں)

جو تیری کائنات کے تناسب سے مسحور ہونے کے بجائے
 آڑی تر چھپی لکیروں میں بے ہنگم انداز میں رنگ پوت پوت کر

انہیں مسح کر کے من مانی قیمتوں پر بے دھڑک بیچتے ہیں
 اور پھر تیری تخلیق کردہ خوبصورت دو شیزوں کے لباسوں سے صرف رنگ ہی نہیں
 تیری تخلیق کی بنیادوں کی طرف جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں
 خدا یا ! مجھے یقین ہے کہ
 تو ان کا حساب الگ سے لے گا
 خدا یا میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ
 میں نے انکی ساری تصویریں گھر سے نکال کر پھینک دی ہیں

خدا یا معاف کر
 اس عظیم شاعر کو جو قرض کی شراب پی کر
 تیری تخلیق کی بد نظمی کا ذکر کیا کرتا تھا
 خدا یا معاف کر
 غالب کو، افتخار جالب کو
 یا اللہ اگر یہ ساری نظمیں تجھے
 یک بہ یک اٹھانے میں کوئی دشواری ہو تو
 کم از کم اپنے بندوں پر ایک چھوٹا سا کرم کر دے
 کہ ردیف اور قافیہ
 جس کا چلن اب دنیا میں صرف دو ملکوں میں ہے
 انہیں فوراً اٹھا لے
 جو باون سال کی طلاق کے بعد بھی

اب بھی نوجہ کھوٹ کرتے رہتے ہیں
 خدا یا ان کی غیر ازدواجی زندگی بھی خوشگوار نہیں رہی
 اب تو اکثر معاملہ آئے دن بمباری اور ہوائی حملوں میں تبدیل ہو گیا ہے
 جس سے دنیا کے سارے پڑوسی اور غیر پڑوسی
 امیر اور غریب ملک مستفیض ہو رہے ہیں
 خدا یا میں اور تیرے ان گنت معصوم اور چند برگزیدہ بندے
 اس بات پر متفق ہیں
 کہ یہ سارا معاملہ رویف اور قافیہ کا ہے
 کبھی اس ملک کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے
 تو کبھی اس ملک کا
 خدا یا اس ملک کا حشر کیا ہو گا
 جو تیر انام لے کر
 ان گنت معصوموں کو ہلاک کرتے ہیں
 اور خدا یا، تیرے بے شمار معصوم بندے
 یہاں ان کی قافیہ پیمانی سے حراساں ہیں
 یا اللہ، تو یہاں اور قیمتوں کی آہ کے علاوہ بھی نہیں سنائی دیتا
 اور انکی جگہ
 دو خوبصورت حوریں (جواب تک صرف مصوروں کے ہاتھ آئیں ہیں)
 انسانی شکل میں ان شاعروں کو بھیج دے
 جوان بیساکھیوں کے سہارے

شہرت کی چوٹیوں پر پھو نچنے کے ممتنی ہیں
 خدا یا میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ
 تیری یہ حوریں باعصمت واپس جائیں گی
 کیوں کہ یہ سب کے سب
 نہایت ہی بے ضرر لوگ ہیں
 خدا یا یہ بھول گئے ہیں وہ گناہ اول اور وہ پرانی بات
 یہ بھول گئے ہیں وہ مشہور مقولہ
 ”کتابوں پر کتابیں لکھ لو پھر بھی کچھ نہیں ہوتا
 کہ اگلے وقت کے لوگوں کے دلفظوں میں تاثیر ہوتی تھی“
 اور جب میں نئی نظموں کی شہوت کے گھلتے ذائقہ میں بتلا رہتا ہوں
 تو پھر مجھے یک لخت میرے ہم عصر
 اُس عظیم ترین تخلیق کار کے حسن کی یاد آتی ہے
 اور اُس کا حسنِ ظن دیکھواں کے باوجود کہ اُسے کبھی نیند نہیں آتی
 جس نے چودہ سو سال سے کچھ لکھا نہیں“

۔۔۔

زیادہ نہیں

اُٹھ اور پھر سے روانہ ہو، ڈر زیادہ نہیں
بہت کئھن سہی منزل، سفر زیادہ نہیں
بیان میں اپنے صداقت کی ہے کمی ورنہ
یہ راز کیا ہے کہ اس پر اثر زیادہ نہیں
سنا ہے وہ مرے بارے میں سوچتا ہے بہت
خبر تو ہے ہی، مگر معتبر زیادہ نہیں
جبھی تو خارِ دلِ دوستاں نہیں ہوں میں
کہ عیب مجھ میں بہت ہیں، ہنر زیادہ نہیں
مجھے خراب کیا اس نے، ہاں کیا ہو گا
اُسی سے پوچھئے، مجھ کو خبر زیادہ نہیں
رشید اپنے لب و لہجہ کو رفو کر لے
کہ ہم سخن ہیں سمجھی، چارہ گر زیادہ نہیں



اردو میں جن شاعروں نے نشری اور آزاد نظم کو فرود دیا، ان میں عین رشید کا نام امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری کی زبان، لمحہ کی جھنکار اور شاعرانہ مزاج صرف جدید ہی نہیں بلکہ ان کا اندازِ پیشکش بھی اتنا پر کشش ہے کہ پڑھنے والوں کے دل ان کی طرف بے ساختہ کھینچنے لگتے ہیں۔ رشید عصر حاضر کے شاعر ہیں۔ اس عہد کے کرب کو انہوں نے محسوس کیا اور بالغ نظری سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی شاعرانہ زبان دوسرے شاعروں سے مختلف ہے۔ اور اس کے ایک ایک لفظ پر انفرادیت کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے۔ ☆